ہو، یا کوئی رسول بھیجے جو زبانِ الٰہی میں وہ باتیں بتائے جو اللہ چاہے۔

یعنی آیت کے آخری حصّہ کا مطلب یہ ہے کہ عام انسانوں تک خدا اپنی باتیں اپنے رسُولوں کے ذریعے (بذریعہ وحی) پہنچاتا ہے اور ڈار صاحب نے اس سے یہ مطلب اخذ کیا ہے، کہ خدا براہ راست عام انسانوں کے دل میں اپنی باتیں ڈال دیتا ہے۔ اس کو وہ وارداتِ قلب کہتے ہیں۔ قرآنی آیت کا یہ مفہوم کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

(۴) بہرحال ہم نے اپنے مسلک کی تصریح (ا) تا (ج) میں کر دی ہے۔ اگر آپ یا کوئی اور صاحب ہمیں یہ بتادیں کہ قرآن کی رُو سے اس میں فلاں بات غلط ہے تو ہم اس کے شکرگزار ہونگے۔ ہم اس حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک دین کے معاملہ میں سند صرف قرآن کریم ہے۔ اس سے باہر جو کچھ پیش کیا جائے وہ اگر قرآن کی تائید کرتا ہے تو خیر، ورنہ وہ ہمارے لئے قطعاً قابلِ قبول نہیں خواہ اس کا کہنے والا کوئی ہو۔"

ثقافت: معلوم ہوتا ہے کہ طلوعِ اسلام نے مسئلہ "عقل و عرفان" (مندرجہ ثقافت ستمبر ۱۹۵۵ء) کو محض مناظرانہ اور سطحی حیثیت سے دیکھ کر اپنا مسلک بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ "قرآن کریم نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ عرفان کا نہیں"۔ اس مسلک کا پہلا حصّہ صحیح ہے اور دُوسرا غلط۔ ہمارے نزدیک ایمان و عرفان دو متضاد چیزیں نہیں اور جیسا کہ مضمون میں بیان کیا گیا تھا، ایمان اور عرفان میں کیفیت (QUALiTY) کا نہیں بلکہ صرف کمیت (QUANTiTY) کا فرق ہے۔ جس چیز کو طلوعِ اسلام بڑے شدّ و مد سے "ایمان" کہتا ہے، اس کے کئی مدارج ہیں۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ایمان لانے والوں سے ایمان کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اکثر انسانوں کے معاملے میں ایمان محض اوپری اور لسانی ہوتا ہے، دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا۔ دُوسری طرف چند نفوسِ قدسیہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایمان کے تمامتر مقتضیات کو پورا کرتے ہیں۔

انسان اپنی دینی زندگی کے لحاظ سے کئی منازل سے گزرتا ہے۔ پہلا درجہ محض سطحی ایمان اور عقیدے کا ہوتا ہے جس میں وہ دوسرے کے کہنے سننے سے ایک چیز کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے بعد شکوک اور شبہات کی روشنی میں وہ اپنے عقائد کی عقلی توجیہ چاہتا ہے اور اس طرح اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ خالص عقلیت کا درجہ ہے جو پہلے درجے سے تو ضرور بلند ہے لیکن نقائص سے خالی نہیں۔ زندگی، حرکت اور جذبے کی کمی انسان کو تخلیقی اعمال سے روکے رکھتی ہے۔ اس کے بعد آخری منزل وہ آتی ہے جب انسان ان عقائد اور اعمال کی حقیقت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر پالیتا ہے۔ اب اسے کسی عقلی توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی اور اس کا کردار ہمہ تن ان اصولوں اور عقائد کا آئینہ دار ہو جاتا ہے:

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا اللہ لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

یعنی توحید کا اقرار اور قرآن حکیم کو اپنا راہنما تسلیم کرنا محض لسانی حیثیت سے بے کار ہے جب تک عقلی توجیہ کے

ساتھ ساتھ قلب کو ہم آہنگ نہ بنایا جائے۔ یہی ہم آہنگی ہے عقل و قلب کی جو انسان کو ایمان کے ہلکے درجے سے اٹھا کر بلند ترین درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق جو اپنی عقل کی راہنمائی سے اسلام کی مخالفت کرتے رہے قرآن فرماتا ہے کہ

ولھم اعینٌ لا یبصرون بھا، ولھم آذانٌ لا یسمعون بھا۔ (۷: ۱۷۹)

(یعنی) وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے، اور کانوں کے ہوتے ہوئے بھی بہرے ہیں۔

ایمان کی بلند ترین منزل کے متعلق ایک بزرگ نے خوب کہا تھا کہ قرآن کی روح اور تعلیم سے انسان اُس وقت صحیح طور پر مستفید ہو سکتا ہے جب اس کا مطالعہ کرتے وقت یوں سمجھے کہ گویا خود اس کے دل پر اس کا نزول ہو رہا ہے۔ محض عقلی توجیہات اور لسانی موشگافیاں عملی حیثیت سے دین کے معاملے میں مؤثر نہیں ہو سکتیں جب تک ایمان قلب کی گہرائیوں میں نہ اُترے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

یہی عرفانِ نفس یا عرفانِ ذات ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ معلوم نہیں طلوع اسلام نے عرفانِ خداوندی سے ذاتِ خداوندی کی کُنہ و حقیقت کو پہچاننا کس طرح اخذ کر لیا۔ زیرِ نظر مضمون میں اس طرف کوئی اشارہ بلاواسطہ یا بالواسطہ موجود نہ تھا۔ تمام بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا کہ "پس ایمان جو طلوع اسلام کے خیال میں دین کا مقصود ہے عرفان کا دوسرا نام ہے"۔ معلوم ہوتا ہے، کہ مروجہ تصوف کے غیر اسلامی تصورات کی جائز مخالفت کے جوش میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ قرآن مجید سے آگے جانے یا پیچھے رہنے کا کوئی سوال نہیں۔ اگر عرفان اتنی ہی بُری چیز ہے تو قبلہ پرویز صاحب کو مشورہ دیجئے کہ وہ اپنی تفسیر قرآن کا نام "معارف القرآن" بدل دیں اگرچہ ہمارے خیال میں معارف القرآن کی ترکیب مثلاً علم القرآن سے کہیں بہتر ہے کیونکہ "معارف" میں وہ گہرائی ہے جو محض "علم" میں نہیں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ کے بعد اُس وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو دین کے معاملے میں ہمارے لئے بطور حجت پیش کی جا سکے۔ لیکن اس مقدمہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مطلقاً وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے قابلِ تسلیم نہیں۔ قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں سورۂ شوریٰ میں اس کا اعلان فرمایا کہ خدا انسان کے دل میں جو وہ چاہے وحی کرتا رہتا ہے اور اس میں کسی پیغمبر یا رسول کی تخصیص نہیں (۴۲: ۵۰)۔ اس آیت کے متعلق تفصیلی بحث آگے نمبر ۳ میں دیکھئے۔ اتنی واضح آیت کی موجودگی میں اس قلبی تعلق کو "ختم نبوت کی مُہر توڑنے کے مترادف" قرار دینا اور اُسے "غیر قرآنی (بلکہ خلاف قرآن) تصور" سمجھنا بڑی جسارت ہے جس کے لئے کوئی قرآنی سند طلوع اسلام کے پاس نہیں۔

اسی آیت (۴۲: ۵۰) کی روشنی میں ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، کہ خدا نے انسان کے قلب میں یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ وُہ خدا سے براہِ راست تعلق پیدا کر سکے اور اس طرح قرآنی تعلیمات پر عمل کر سکے۔ سورہ حم سجدہ میں خُدا فرماتا ہے:

سنریهم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسهم ...الخ (۴۱:۵۳)

جلدی ہی ہم اُن کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائینگے ۔

اس آیت میں نفسِ انسانی میں نشانیاں دکھانے سے کیا مراد ہے ؟ کیا آیات خداوندی کا مظہر آفاق اور انفس دونوں نہیں ؟ اس سے صاف عیاں ہے کہ جہاں تاریخ انسانیت اور مظاہر فطرت ہمارے ذرائع علم ہو سکتے ہیں وہاں انسان کی نفسیاتی کیفیات بھی ہماری راہنمائی کر سکتی ہیں ۔ قلبی واردات سے انکار واقعات کی تکذیب ہے اور اس کے ذریعۂ علم ہونے سے انکار محض تصوف کے خلاف تعصب کا نتیجہ ۔ جس طرح قرآن حکیم کی تعلیم سمجھنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے اسی طرح ان نفسی کیفیات کی بھی ضرورت ہے جن کو ہم نے عرفان کا نام دیا ہے ۔ محض عقل کی نارسائی طلوع اسلام کو بھی تسلیم ہے اور نہ محض عرفان ہمارے کسی کام کا ہے ، دونوں کے صحیح امتزاج ہی سے دین کا کام چل سکتا ہے ۔ قرآن مجید یقیناً ہماری راہ نمائی کے لئے کافی ہے لیکن یہ نعرہ (SLOGAN) کوئی منتر نہیں جس سے سمجھنے سمجھانے کی تمام مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی ۔ اس کے لئے ہمیں ہر قسم کے ذرائع علم، علوم آفاق وانفس سے فائدہ اُٹھانا ہوگا اور ان میں سے ایک ذریعۂ علم قلبی واردات بھی ہے جس کی تائید قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات (۴۲: ۵۰ اور ۴۱ : ۵۳) سے ہوتی ہے ۔

۲ - صرف عقل کی راہنمائی سے ادراک حقیقت حاصل ہونے سے انکار کا اعلان طلوع اسلام کے ٹائیٹل پر "مقصد و مسلک" کے تحت تو ضرور ہوتا ہو گا لیکن ۱۷ اپریل کے شمارے میں (صفحہ ۱۴) "عرفان الٰہی" کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اسی عقل محض کا راگ ضرور چھیڑا گیا تھا اور قرآنی تفکر و تدبر کو استدلالی عقل تک محدود کرنے کی بیفائدہ کوشش کی گئی تھی ۔ اسی نقطۂ نظر کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے معارف القرآن کے حوالے دیئے گئے تھے ۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ صرف عقل ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتی اور اسی لئے عرفان کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا ۔ ان دونوں کے صحت مندانہ امتزاج سے ہی قرآنی نظریۂ حیات پر عمل کیا جا سکتا ہے ۔

۳ - واردات قلب کی تائید کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل قرآنی آیت بطور دلیل پیش کی گئی تھی :

وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب

او یرسل رسولاً فیوحی باذنه ما یشاء ۔ (۴۲ : ۵۰)

طلوع اسلام کو اس کے ترجمے کے آخری حصے پر اعتراض ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے اپنے نظریے کی تائید میں، قرآنی آیت کا غلط مفہوم پیش کر دیا ہے ۔ اس کے بعد قبلۂ محترم سید جعفر شاہ صاحب رکن ادارۂ ثقافت اسلامیہ کا ترجمہ بھی بطور مقابلہ لکھا ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "خدا اپنی باتیں اپنے رسولوں کے ذریعے (بذریعۂ وحی) پہنچاتا ہے" اس کے برعکس میرے نزدیک اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہی اور صرف یہی ہے کہ "خدا براہ راست عام

انسانوں کے دل میں اپنی باتیں ڈال دیتا ہے"۔ مذکورہ بالا مفہوم بالکل صحیح ہے اور اس کی تائید کے لئے (مجھے معاف فرمایئے) میں پھر معارف القرآن جلد دوم، طبع اوّل کے صفحہ ۲۸۴ کا حوالہ دیتا ہوں جہاں یہی آیت معہ ترجمہ درج ہے۔ یہ دیکھ کر ناظرین حیران ہونگے کہ قبلہ پرویز صاحب نے اس کا ترجمہ بالکل وہی کیا ہے جو مضمون زیر نظر میں کیا گیا تھا اور جو طلوع اسلام کے نزدیک قطعاً غلط ہے۔ معارف القرآن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اور (دیکھو) کسی انسان کی یہ حیثیت نہیں، کہ خدا اس سے ہم کلام ہو، مگر (صرف تین صورتوں میں) بطور وحی کے، یا حجاب (پردہ) کے پیچھے سے یا یہ کہ کوئی قاصد (فرشتہ) بھیجے اور وہ خدا کے حکم سے جو وہ چاہے اس کے دل میں ڈال دے۔

صاحب معارف القرآن نے "رسول" کا ترجمہ قاصد اور مفہوم فرشتہ متعین کیا ہے اور یہی بلاشک و شبہ اس کے یہاں صحیح معنی ہیں۔ اب صحیح اور غیر صحیح کا فیصلہ ناظرین کے سامنے ہے۔ اب اگر ہمارا ترجمہ صحیح ہے اور اس لئے جس مسئلے کی تائید میں یہ آیت پیش کی گئی تھی، وہ بھی صحیح ہے، تو طلوع اسلام کو چاہیئے کہ وہ تسلیم کرے کہ خدا اور انسانوں کے درمیان قلبی تعلق ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، اور خدا براہِ راست عام انسانوں کے دل میں اپنی باتیں ڈالتا ہے۔ یہی عرفانِ نفس یا عرفانِ ذات ہے جو قرآن فہمی میں مدد دے سکتا ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے آپ بلاوجہ ختم نبوت کی مُہر ٹوٹنے کا اندیشہ کریں۔

۴۔ اس بحث سے مقصد مناظرہ یا مجادلہ نہیں، بلکہ محض مسئلہ زیر نظر کی صحیح نوعیت کا تعین ہے۔ ہم نے کوشش کی تھی اور اب بھی کی ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر واضح ہو جائے اور وہ بھی قرآن حکیم کی صریح آیات کی روشنی میں جو آپ کیلئے اور ہمارے لئے بھی سند ہے اس کا فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ (بشیر احمد ڈار)

حکمتِ رُومی

مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار و نظریات ایسے دائمی حقائق ہیں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت میں گردشِ زمانہ کوئی کمی نہ کر سکی اور ان کی مثنوی سے جس کو "قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے، علامہ اقبال بھی ویسے ہی متاثر ہوئے جیسے کہ مولانا جامی حکمتِ رومی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ جو ماہیت نفسِ انسانی، عشق و عقل، وحی و الہام، وحدتِ وجود، احترامِ آدم، صورت و معنی، عالمِ اسباب اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے، اور خلیفہ صاحب نے مولانائے رُوم کے افکار کا دُوسرے حکماء کے خیالات سے موازنہ کرتے ہوئے انکی حکیمانہ تشریح کی ہے۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے انشاء پریس لاہور میں چھپوا کر کلب روڈ لاہور سے شائع کیا۔